داعی اور دعوت

مولانا ابواللیث ندوی
مولانا جلیل احسن ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا ابواللیث ندوی

دعوت و تبلیغ

دعوت و تبلیغ کی شرعی حیثیت، اس کی اہمیت، اس کے مراحل و مقامات اور ہر مرحلے کے مخصوص احکام اور تقاضوں پر ہمارے لٹریچر میں بہت کافی گفتگو کی جا چکی ہے۔ لیکن ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے کچھ رفقاء، بالخصوص ان میں جو لوگ نئے نئے اس میدان میں وارد ہوئے ہیں، اس سلسلے کی بعض ضروری باتوں کو اپنی عملی سرگرمیوں میں پوری طرح ملحوظ نہیں رکھتے ہیں۔ اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس قسم کی چند باتوں کی طرف مختصراً توجہ مبذول کرائی جائے۔

دعوت و تبلیغ کے لیے جو بات اصل اساس کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ کام خالصاً لوجہ اللہ انجام دینا چاہیے اور اللہ کی رضا و خوش نودی کے علاوہ اس سے اور کوئی غرض و مطلب نہیں رکھنا چاہیے۔ شریعت میں کسی کام کے دینی یا غیر دینی ہونے یا اس پر مستحق ثواب ہونے یا نہ ہونے کا بڑا دارومدار نیت ہی پر ہے۔ ایک ایسا کام جو بہ ظاہر دنیاوی قسم ہی کا کام کیوں نہ ہو۔ اگر اللہ کی خوش نودی حاصل کرنے کے جذبے کے تحت اس کے حکم کے مطابق انجام دیا جائے تو وہی کام سراسر نیکی کا کام بن جاتا ہے اور اس پر ثواب کا استحقاق پیدا ہوتا ہے:

فِیْ بُضْعِ اَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ

"تمھاری شرم گاہ (کے صحیح استعمال) میں بھی نیکی ہے۔"

اس جیسی مختلف احادیث سے واضح ہوتا ہے اور اس کے برعکس ایک خالص دینی کام بھی دنیاوی بن جاتا ہے۔ اگر وہ خلوص نیت کے ساتھ انجام نہ دیا جائے اور اللہ کی رضا کے سوا اس سے کوئی اور غرض وابستہ کرلی جائے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرء ما نویٰ فمن کانت هجرته الی اللّٰه و رسوله فهجرته الی اللّٰه و رسوله و من کانت هجرته الٰی دنیا یصیبها او الٰی امرأةٍ یتزوّجها فهجرته الٰی ماهاجر الیه۔ (بخاری مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

''اعمال کا دارومدار سراسر نیتوں پر ہے اور ہر انسان کے لیے وہی ہے، جس کی اس نے نیت کی۔ تو جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہوگی۔ اور جس کی ہجرت دنیوی فائدے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہوگی تو اس کی ہجرت بس اسی کے لیے ہے، جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔''

حد یہ ہے کہ قتال فی سبیل اللہ جیسا خالص دینی کام بھی، جس میں انسان اپنی جان تک قربان کردیتا ہے۔ اگر خلوص نیت سے خالی ہو تو اس پر بھی وہ کسی اجر و ثواب کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا۔

ارأیتَ رجلاً غزا یلتمس الاجر والذکر مالهٗ فقال رسول اللّٰه ﷺ. لا شیء له فاعادها ثلٰث مرار و یقول رسول اللّٰه ﷺ لا شیء له ثم قال ان اللّٰه عزّوجل لا یقبَل من العمل الا ما کان له خالصاً وابتغی به وجهه۔ (ابوداؤد و نسائی)

''آپ کا کیا خیال ہے اس شخص کے بارے میں جو (دین کو سربلند کرنے کے سلسلے میں) اس لیے جنگ کرتا ہے کہ اسے ثواب بھی ملے اور اس کی شہرت بھی ہو، اسے کیا ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسے کچھ (اجر) نہیں ملے گا۔ سائل نے تین بار یہی سوال کیا اور آپ ہر بار یہی فرماتے رہے کہ کچھ نہیں ملے گا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسی عمل کو قبول فرماتا ہے، جو خاص طور سے اسی کے لیے کیا گیا ہو اور جس سے اس کی رضا مقصود ہو۔''

پس ہم جو کام بھی کریں سب سے پہلے ہمیں اپنی نیت کا جائزہ لینا چاہیے کہ اس سے مقصود محض خدا کی رضا ہے یا اس میں خدانخواستہ کوئی شائبہ ان جذبات کا بھی شامل ہوگیا ہے، جو نیکیوں کو غارت کردینے والے ہیں۔ یعنی ریا و نمود، حب جاہ و شہرت، یا کوئی ذاتی، گروہی اور قومی مفاد وغیرہ اور جو کام اپنی ظاہری شکل و صورت میں خالص دینی کام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً دعوت و تبلیغ کا کام

تو ان کے سلسلے میں تو زیادہ گہرائی کے ساتھ اپنے دلوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ایسے کاموں کے سلسلے میں آدمی بڑی آسانی کے ساتھ فریب نفس کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان کی ظاہری شکل و صورت کو نمایاں کر کے نفس یہ دھوکا دیتا ہے کہ وہ دینی کام انجام دے رہا ہے جس پر وہ اجر و ثواب کا مستحق ہوگا لیکن نیت چوں کہ خلوص سے خالی ہوتی ہے اس لیے نہ وہ دینی کام ہوتا ہے اور نہ اس پر اجر و ثواب کا وہ مستحق قرار پا سکتا ہے۔

پھر کوئی کام شروع کرتے وقت ایک بار یہ طے کر لینا کہ وہ اسے اللہ کے لیے انجام دے گا، کافی نہیں ہے۔ شیطان انسان کا دشمن ہے، وہ برابر اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ جس مرحلے میں بھی وہ اس کی نیکیوں کو ضائع کر سکتا ہو ضائع کر دے۔ چناں چہ بسا اوقات اختتام کے قبل وہ اس میں کام یاب ہو جایا کرتا ہے اور تبلیغ و اشاعت دین کے کاموں کو ضائع کرنے کی طرف تو وہ خاص طور سے متوجہ رہتا ہے کیوں کہ ان کا عند اللہ بڑا اجر و ثواب بھی ہے اور ان کاموں کی زد اس کے شیطانی کاروبار پر بھی بہت سخت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر خاص تبلیغ و اشاعت دین سے متعلق سلسلۂ کلام میں ہی نزعات شیطانی کا تذکرہ کر کے ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف میں آں حضرت ﷺ کو یہ حکم دیا گیا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۝

(الاعراف:۱۹۹)

"(اے محمدؐ) عفو اختیار کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کر لو۔"

اور اس کے بعد فرمایا گیا ہے:

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۝ۚ

(الاعراف:۲۰۰،۲۰۱)

"اور اگر شیطان کی طرف سے تمھارے دل میں کوئی غلط تحریک پیدا کی جائے تو خدا سے پناہ مانگو۔ بے شک وہ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو لوگ پرہیزگار ہیں جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیدا ہوتا ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں اور (دل کی آنکھیں کھول کر) دیکھنے لگتے ہیں۔"

سورۂ حٰمٓ السجدہ میں فرمایا گیا ہے:

وَلاَ تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلاَ السَّیِّئَةُ ط اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ o وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ o وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ط اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ o

(حٰمٓ السجدہ: ۳۴-۳۶)

''بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تم (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو۔ ایسا کرنے سے تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ اور یہ بات ان ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور ان ہی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔ اور اگر تمھیں شیطان کی جانب سے غلط بات سمجھائی جائے تو خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔ وہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

ان آیتوں کے موقعِ کلام پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نزعات شیطانی سے خاص طور سے وہ جذبات مراد ہیں، جو منکرین ومخالفین کی بے جا مخالفتوں اور اشتعال انگیزیوں کے وقت غلط طور سے دل میں ابھرتے ہیں اور داعیانِ حق کو اعتدال وسلامت روی کی راہ سے بھٹکا دیا کرتے ہیں۔ اور یہاں یہ بھی خاص طور سے پیش نظر رکھنے کی بات ہے کہ اس قسم کی نزعات شیطانی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کو کس انداز میں سراہا گیا ہے اور اس کو کتنا بلند مقام عطا فرمایا گیا ہے۔ پس حق کے داعیوں کا فرض ہے کہ وہ مخالفت واشتعال کے انتہائی نازک مواقع پر بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں اور شیطان کو کبھی اس کا موقع نہ دیں کہ وہ اپنی وسوسہ اندازیوں اور غلط تحریکات سے ان کو بے راہ روی میں مبتلا کر کے ان کے نیک کاموں کو غارت کر دے۔ اس موقعے پر یہ بات فراموش نہ ہونے دیں کہ نیکی کا دارومدار جب نیت پر ہے تو شیطان کی بڑی کوشش نیتوں ہی میں خلل پیدا کرنے پر صرف ہوتی ہے۔ مثلاً وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ انسان کے ذاتی یا گروہی وقومی جذبات کو اس طرح ابھار دے کہ وہی اس پر چھا جائیں اور خدا کے لیے کام کرنے کا جذبہ مغلوب ہو جائے یہ بڑی خطرناک بات ہوتی ہے جن پر اس حیثیت سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جب جہاد جیسا کام بھی، جس میں جان تک قربان کر دی جاتی ہے، باعتبار اجر وثواب بے نتیجہ ہے۔ اگر وہ کسی گروہی یا قومی عصبیت کے تحت انجام دیا گیا ہو، تو تبلیغ ودعوت کی دوڑ دھوپ اور اس سلسلے کی

مشقتیں کیا کار آمد ہوسکتی ہیں۔ اگر وہ خالصاً خدا کے لیے ہونے کی بہ جائے کسی گروہ یا قومی مفاد یا تعلق کی بنا پر انجام دی جائیں۔

دوسری بات جو خاص طور سے ملحوظ رکھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کا کام حقیقتاً انبیاء کرام علیہم السلام کا کام رہا ہے، اس لیے جب آں حضرت ﷺ کے بعد رسالت ونبوت کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور اس کام کی مخصوص ذمے داری ان لوگوں پر عائدہ ہوگئی جو آپ کے نام لیوا ہیں تو انھیں اس کام کی انجام دہی میں ہرصورت ان کے ہی اسوۂ حسنہ اور ان کی ہدایات کی پابندی اختیار کرنی چاہیے۔ اس سے ہٹ کر جو کام کیا جائے گا وہ غلط بھی ہوگا اور اس سے وہ نتائج بھی برآمد نہیں ہوسکیں گے جو مطلوب ہیں۔

انبیاء کرامؑ کے اسوۂ حسنہ اور ہدایات سے دعوت وتبلیغ کے جو اصول متعین ہوتے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں جن کو لٹریچر کی بعض مخصوص کتابوں میں تفصیل کے ساتھ پیش بھی کردیا گیا ہے لیکن اس موقع پر ان میں سے چند کی طرف شدت کے ساتھ توجہ مبذول کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی دعوت وتبلیغ میں حکمت وتدریج کا تو ضرور لحاظ کیا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حق انھیں ملا تھا اس کو پیش کرنے میں وہ غیر اللہ کے خوف سے کسی درجہ میں متاثر ہوئے ہوں، ان کی دعوت وتبلیغ کی اساس تو قائم ہی اس بات پر تھی کہ اللہ کے سوا سب کا خوف دلوں سے نکال دیں۔ پھر وہ خود اپنے کاموں میں کس طرح اس سے متاثر ہوسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں انبیاء کرام کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان میں ان کو نہتے اور ظاہری حیثیت سے بے یار ومددگار ہوتے ہوئے بھی وقت کے فراعنہ ونماردہ کو بے خوف وخطر مخاطب کرتے ہوئے دکھلایا گیا ہے اور عین اس وقت جب کہ مخالف قوتیں ان کو فنا کے گھاٹ اتار دینے کے لیے اکٹھی ہورہی ہیں، ان کو اس حیثیت سے پیش کیا گیا ہے کہ اللہ پر اعتماد نے ان کو ہر خوف سے بے پروا کردیا ہے اور وہ ان سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں ہیں۔ سورۂ ہود وغیرہ میں ان کی یہ خصوصیت پوری طرح نمایاں ہے اور مصلحت وتدریج وغیرہ کا انھوں نے لحاظ کیا بھی ہے تو اس کی بنا شفقت علی الناس وغیرہ پر قائم ہے نہ کہ کسی جذبۂ خوف پر۔ پھر قرآن مجید میں اس بات کے لیے صریح احکام بھی ملتے ہیں کہ دعوت وتبلیغ میں اللہ کے احکام کو واشگاف طور سے پیش کیا جائے اور اس میں غیر اللہ کے خوف کو مطلق اثراندازی کا موقع نہ دیا جائے۔ سورۂ احزاب میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًاO وَّاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًاO وَّ تَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًاO (الاحزاب:۱-۳)

"اے پیغمبرؐ! خدا سے ڈرتے رہو اور کافروں اور منافقوں کے کہنے میں نہ آؤ۔ بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اور جو تم کو تمھارے پروردگار کی طرف سے وحی کی جاتی ہے اسی کی پیروی کرو بے شک خدا تمھارے تمام کاموں سے باخبر ہے اور خدا پر بھروسا رکھو اور وہی کارساز ہے۔"

پس جو لوگ دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینا چاہتے ہیں انھیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس راہ میں غیر اللہ کے خوف کا کوئی مقام نہیں ہے۔

(۲) جب انبیاء کرام کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جو کچھ ان کو حکم ملا ہے اس کی انھوں نے بے خوف و خطر تبلیغ کی ہے اور جو لوگ ان کے بعد ان کی نیابت میں یہ کام انجام دینا چاہتے ہیں ان کو بھی اسی طریقے کی تقلید کرنی ہے، تو یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ اس راہ میں طرح طرح کی مشکلات و مصائب پیش آئیں۔ انسان کی فطرت میں خیر کی طلب ضرور رکھی گئی ہے۔ لیکن یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس لیے اس کو خیر و شر کے اختیار کرنے میں یک گونہ آزادی بھی بخشی گئی ہے اور اسی کے ساتھ جس طرح خیر کو اختیار کرنے کے بہت سے محرکات پیدا کیے گئے ہیں، شر کے اختیار کرنے کے بھی اسباب اندرونی و بیرونی محرکات انسان میں اور انسان کے اردگرد پیدا کیے گئے ہیں جن سے انسان لامحالہ متاثر ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ خیر کی طلب کا جو جذبہ فطرتاً ودیعت ہوا ہے بسا اوقات وہ بھی مختلف اسباب کے تحت مضمحل یا فنا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگوں کے سامنے حق بات کہی جائے اور سب کے سب اس کے قبول پر آمادہ ہو جائیں۔ انبیاء کرام سے بڑھ کر حکمت تبلیغ و دعوت کا کون رمز آشنا ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ان سب کو شدید مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور طرح طرح کے مصائب و مشکلات ان کو پیش آئی ہیں۔ بلکہ قرآن مجید کے مطالعہ سے تو یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ دنیا کو خیر و شر کا اس طرح آماجگاہ بنانے کا ایک منشا یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے لوگوں کا امتحان ہو سکے۔ چناں چہ فرمایا گیا ہے:

وَجَعَلْنَا بَعْضَکُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَۃً ط اَتَصْبِرُوْنَ ج وَ کَانَ رَبُّکَ بَصِیْرًاO (الفرقان:۲۰)

''اور ہم نے تم میں سے ایک کو دوسرے کے لیے امتحان کا ذریعہ بنایا، تو کیا تم (حق پر) جمتے ہو اور تمھارا رب سب کچھ دیکھ رہا ہے۔''

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَ نَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ (محمد:۳۱)

''اور ہم تم کو ضرور آزمائیں گے یہاں تک کہ یہ معلوم ہو جائے کہ تم میں کون لوگ (اللہ کی راہ میں) جدوجہد کرنے والے اور صبر و استقامت والے ہیں۔''

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَا انْتَصَرَ مِنْهُمْ وَ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ (محمد:۴)

''اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا، مگر (یہ طریقہ اس نے اس لیے اختیار کیا ہے) تا کہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے۔''

پس جو لوگ دعوت و تبلیغ کا کام انجام دینا چاہتے ہیں، ان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ باہر کے مخالفین کا مقابلہ کرنے سے پہلے اپنے نفس کا مقابلہ کریں اور اس کو اس راہ کے مصائب و مشکلات پر راضی و صابر رہنے کا عادی بنائیں۔ نفس کا جہاد ہی سب سے بڑا جہاد ہے اور اس جہاد میں کام یابی حاصل کرنے کے بعد ہی شیطان اور دیگر مخالفین سے جہاد میں وہ کام یابی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو ان دشوار گزار مراحل سے ضرور گزارتا ہے، جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

الٓمّٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (العنکبوت:۱-۳)

''ا۔ل۔م۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ''ہم ایمان لے آئے'' کہنے کے بعد انھیں چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو آزمائشوں میں ڈالا نہ جائے گا۔ حالاں کہ ان سے قبل کے لوگوں کو ہم نے آزمائشوں میں ضرور ڈالا ہے، تو اللہ جان کر رہے گا کہ کون (دعوائے ایمان میں) سچا ہے اور کون جھوٹا۔''

لیکن اگر وہ اس میں ثبات و استقامت دکھلائیں تو وہ ہر قدم پر ان کی مدد فرمائے یہاں تک کہ اپنے فرشتۂ غیب کو حکم دے دیتا ہے:

اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ (الانفال:۱۲)

''میں تمھارے ساتھ ہوں، تم اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو۔''

(۳) جب یہ ممکن نہیں ہے کہ حق بات چاہے جس حکمت کے ساتھ بھی پیش کی جائے لامحالہ لوگ اسے قبول ہی کر لیں بلکہ اس سے آگے یہ عین اس کام کی فطرت کا تقاضا ہے کہ لوگ اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں تو یہ ظاہر بات ہے کہ دعوت وتبلیغ کا کام انجام دینے والوں کو اس سے بھی بددل و مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی کوششوں کے حسبِ منشا نتائج دنیا میں برآمد نہیں ہوتے۔ بے شک انسان فطرتاً یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ جو کچھ کرے اس کے نتائج بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، اور یہ خواہش ایک معقول حد تک کچھ غیر پسندیدہ بھی نہیں ہے۔ لیکن جب یہ خواہش اپنے حدود سے تجاوز کر جاتی ہے تو اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جب نتائج حسب خواہش برآمد نہیں ہوتے تو اس کی کوششوں پر اضمحلال طاری ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات وہ مایوس ہو کر بیٹھ رہتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ خواہش کی یہ افراط بھی اکثر وسوسہ شیطانی ہی سے پیدا ہوتی ہے اور اس سے شیطان کی یہ غرض ہوتی ہے کہ تبلیغ و دعوت کا کام کرنے والوں کو اس کام سے روک دے۔ اس لیے اس فتنہ سے پوری طرح باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں خود آں حضرت ﷺ کو متعدد مقامات پر اس طرح کی خواہش سے روکا گیا ہے اور ان مقامات پر بنیادی طور سے جو باتیں نمایاں کی گئی ہیں وہ یہی ہیں کہ یہ دنیا خیر وشر کی آماجگاہ ہے اور انسان کے لیے دارالامتحان کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے یہ توقع صحیح نہیں ہے کہ سب کے سب قبولِ حق پر آمادہ ہی ہو جائیں گے۔

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ ○ (الانعام:۳۵)

"اور اگر ان کا اعراض کرنا (اے نبیؐ) تم پر گراں ہو، تو اگر تمھارے بس میں ہو، تو زمین میں کوئی سرنگ تلاش کرو یا آسمان میں کوئی سیڑھی لگاؤ اور ان کے لیے (انسان کے حسب منشا) کوئی معجزہ لے آؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا، تو تم جذبات کی رو میں بہنے والے نہ بنو۔"

اور یہ کہ داعیانِ حق کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ دعوت وتبلیغ میں اپنی طرف سے حتی الوسع کوئی کوتاہی نہ کریں۔ نہ یہ کہ وہ سب کو قبول پر آمادہ کر دیں:

وَ اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ ○ (الرعد:۴۰)

”اور اگر (اے نبیؐ) ہم تمھیں کچھ وہ حالات دکھا دیں جن کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں۔ یا تمھیں وفات دے دیں بہ ہر صورت تمھارے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے اور حساب ہمارے ہی ذمہ ہے۔“

اور اس سلسلے میں سب سے بڑی اس حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے کہ داعیانِ حق کو سب کچھ رضاء الٰہی اور آخرت کی کامرانی کے تصور کے تحت کرنا چاہیے نہ کہ کسی دنیاوی کام یابی کے تصور کے تحت، چناں چہ جہاں کہیں بھی دین کی راہ میں جدوجہد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے تقریباً ہر جگہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کام یابی ہی کو اصل مقصود قرار دینے کی تاکید کی گئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دنیا میں دینی جدوجہد کا کچھ بھی نتیجہ برآمد نہ ہو تو بھی کام کرنے والوں کو اپنی جگہ اطمینان ہونا چاہیے کہ وہ ناکام نہیں ہیں۔

ان باتوں کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس صورت میں کوئی مایوسی طاری نہ ہوگی جب کہ حسبِ توقع زیادہ لوگ ان کی دعوت پر لبیک نہ کہیں، بلکہ اگر ایسا ہو کہ حالات کے زیر اثر یا نفس و شیطان کے مکائد کا شکار ہو کر داعی کے کچھ اپنے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں تو بھی داعی کے عزم و استقلال میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں اوّل و آخر چیز بس خلوص نیت ہی ہے۔ یہ اگر موجود ہو تو اس کے بعد اس بات کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ کوئی شخص یہ بھی سوچے کہ دعوت و تبلیغ کے کچھ اصول اور ضابطے بھی ہیں یا نہیں، اسے بس اللہ کا نام لے کر دعوت کا کام شروع کر دینا چاہیے۔ وہ جس طرح بھی یہ کام انجام دے گا اللہ کی خوش نودی اور اجر ہی کا مستحق ہوگا۔ بلکہ بعض لوگ تو اس انداز سے سوچنے ہی کو خلوص نیت کے منافی سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے کچھ اصول اور ضابطے ہونے چاہئیں اور ان کی پابندی لازم ہے۔ ہمارے نزدیک یہ طرز فکر صحیح نہیں ہے اور اس سے گوناگوں مفسدے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کے متعلق اپنے ذہن کو صاف کر لینے کی ضرورت ہے۔

اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ خلوص نیت، جیسا کہ اس سے پہلے ہم خود لکھ چکے ہیں ہر کام کی طرح دعوت و تبلیغ کے کام کی بھی روحِ رواں ہے اور اس کے بغیر نہ اسے کوئی دینی کام سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس سے اجر و ثواب کی توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ بات کسی طرح خلوص کے منافی نہیں ہے کہ اس کام کو ادا کرنے کے لیے مفید اور مناسب طریقوں کی پابندی کا قصد و اہتمام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ دعوت و تبلیغ بھی من جملہ ان فرائض کے ہے جن کا حکم قرآن و سنت میں شدید ترین تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اس لیے جب دیگر واجبات و فرائض کو ادا کرنے کے لیے ان کے

مناسب و متعین طریقوں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اس کو خلوص کے منافی نہیں سمجھا جاتا تو دعوت و تبلیغ کے فریضہ کو بھی اگر کچھ معروف و متعین طریقوں کی پابندی کے ساتھ ادا کرنے کا قصد کیا جائے تو یہ خلوص نیت کے منافی کس طرح ہو سکتا ہے۔ پھر بات اتنی ہی نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت سے واضح طور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا منشا بھی یہ ہے کہ یہ کام بس یونہی جس طرح جی میں آئے کر گزرنے کا نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ مخصوص طریقے ہیں، جن کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ چناں چہ قرآن مجید کی مشہور آیت ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط (النحل:۱۲۵)

"اپنے رب کی راہ کی طرف دعوت دو، حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور ان سے اس طریقے سے بحث کرو، جو سب سے بہتر ہو۔"

اس آیت سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کا کام ایسا نہیں ہے کہ آدمی جس انداز میں چاہے کرنے لگے بلکہ اس کے کچھ معروف طریقے ہیں۔ چناں چہ خود اس آیت میں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی یہ کہ دعوت کی ابتدا کس طرح کی باتوں سے ہونی چاہیے اور جب نتیجتاً مخاطبین دو گروہوں ـــــ موافقین و مخالفین ـــــ میں تقسیم ہو جائیں تو پھر ہر دو کے ساتھ کیا انداز خطاب و عمل اختیار کرنا چاہیے۔ پہلی بات کی طرف اشارہ لفظِ حکمت کے ساتھ کیا گیا ہے اور بعد کے دونوں پہلوؤں پر بالترتیب لفظ 'موعظة' جو اُدْعُ سے متعلق ہے اور جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسی طرح کی اور بھی بے شمار آیتیں ہیں جن میں دعوت کے اور بہت سے طور طریق کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔

پھر قرآن مجید چوں کہ بہ جائے خود ایک دعوت ہے، اس لیے خود اس کی ترتیب نزول اور طریق خطاب وغیرہ پر نگاہ رکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے حکیمانہ اسلوب ہیں اور ان کو خود حکیم مطلق نے بھی بندوں کے ساتھ اپنے خطاب میں اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ابتداءِ عہد نبوت میں قرآن کا نزول تھوڑا تھوڑا اور طویل و قصیر وقفوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ ظاہر ہے، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا تعلق بھی دعوت و تبلیغ کے حکیمانہ اصولوں اور طریقوں ہی سے ہے، جو بہ ادنیٰ تامل سمجھ میں بھی آ سکتا ہے یعنی ابتداءِ عہدِ نبوت میں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ لوگوں کی استعداد قبول وغیرہ کا لحاظ کرتے ہوئے اتنی ہی مقدار میں اور ایک

مناسب وقفہ کے بعد ہی غذا دی جائے جسے وہ بہ آسانی ہضم کرسکیں ورنہ ہوسکتا تھا کہ شروع ہی میں وہ اپنے خلاف مزاج باتیں سن کر مزید کچھ سننے ہی سے انکار کر بیٹھتے۔ چناں چہ خود قرآن پاک کی متعدد آیات میں قرآن کے اس طرح تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کی مصلحتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ مثلاً ایک آیت میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّقۡضٰۤی اِلَیۡکَ وَحۡیُہٗ ۫ وَ قُلۡ رَّبِّ زِدۡنِیۡ عِلۡمًا ﴿﴾ وَلَقَدۡ عَہِدۡنَاۤ اِلٰۤی اٰدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَہٗ عَزۡمًا ﴿﴾ (طٰہٰ: ۱۱۴، ۱۱۵)

”اور قرآن کے سلسلے میں جلدی نہ کرو قبل اس کے کہ اس کی وحی ختم ہو۔ ہاں یہ دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب! میرا علم زیادہ کر۔ اور بے شک ہم نے اس سے قبل آدم کو ایک بات کی تاکید کی تھی تو ان سے غفلت ہوگئی اور ہم نے ان میں ارادہ کی پختگی نہ پائی۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس بات کے خواہش مند تھے کہ قرآن مجید اپنی مکمل شکل میں جلد از جلد نازل کر دیا جائے اور یہ آپؐ کی ایک بالکل فطری خواہش تھی۔ اس سے بڑھ کر آپ کے لیے اور کیا چیز محبوب ہوسکتی تھی کہ اللہ کی شریعت جلد از جلد مکمل ہو جائے اور اس وقت جن مخالفتوں اور مزاحمتوں کے طوفان میں آپ گھرے ہوئے تھے، ان میں آپ کا سب سے بڑا سہارا بھی بس یہی تھا کہ ایک طرف آپ اللہ سے ہم کلام ہو کر تسلی و تشفی حاصل کریں اور دوسری طرف اس کے ذریعے ان شکوک و اعتراضات کا جواب دے سکیں، جو مخالفین کی طرف سے پیش کیے جا رہے تھے اور جن میں ایک اعتراض خود یہ بھی تھا کہ آپ پر یکبارگی پورا قرآن کیوں نہیں نازل کر دیا جاتا۔ یہی اسباب تھے جن کی بنا پر آپ کلام الٰہی کے لیے سراپا اشتیاق تھے اور جونہی اس کا کوئی ٹکڑا نازل ہوتا آپ ہمہ تن شوق بن کر اس کو جلدی جلدی دہرانا شروع کر دیتے، جس کا ایک دل آویز نقشہ اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا خطاب اور لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ وغیرہ آیات سے نظروں میں پھرنے لگتا ہے۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے محض دعوت و تبلیغ کی مصلحتوں کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اس خواہش کا لحاظ نہیں فرمایا اور اس کی مختلف مصلحتیں بیان فرما کر آپ کو مطمئن کیا گیا۔ چناں چہ مذکورہ بالا آیات میں اس کی حکمت یہ بتائی گئی کہ انسان کم ہمت واقع ہوا ہے، اس لیے وہ دفعتہً پوری شریعت کا متحمل نہیں ہوتا اور اس کی دیگر مصلحتیں دوسری آیتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ جو لوگ اس کی تفصیل سمجھنا چاہیں ان کو مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۃ القیامۃ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ابتداءِ عہد نبوت میں قرآن کی جو آیتیں نازل ہوتی تھیں ان

میں عام طور سے اساسی معتقدات پر گفتگو کی جاتی تھی یا ان باتوں پر زیادہ زور دیا جاتا تھا جو خود عربوں میں ان کے لاکھ بگاڑ کے باوجود پسندیدہ سمجھی جاتی تھیں، اس بات کا تعلق بھی ظاہر ہے حکمت وطریق دعوت ہی سے ہے۔ چناں چہ حضرت عائشہؓ نے اپنے اس مشہور قول کے ذریعے اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

انما نزل اول ما نزل سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنّار حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام و لو نزل اول شيىء لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر و لو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا۔ (بخاری باب تالیف القرآن)

''قرآن مجید میں جو سورۃ پہلے نازل ہوئی وہ مفصل کی ایک سورۃ تھی، جس میں جنت اور دوزخ کا ذکر تھا یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف رجوع ہو گئے تو حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے۔ اور اگر شروع ہی میں یہ حکم آتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے ہم شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر یہ حکم آتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے ہم زنا نہ چھوڑیں گے۔''

اسی طرح اگر آپ حدیث وسیرت کا مطالعہ فرمائیں تو وہاں بھی دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں مخصوص باتوں سے بچنے اور مخصوص طریقوں کے اختیار کرنے کی تعلیم وتلقین ملے گی اور ساتھ ہی اس بات کا بھی پتہ چلے گا کہ آپؐ نے خود اپنی دعوت وتبلیغ میں بہت سے متعین اصولوں اور طریقوں کی پابندی اختیار فرمائی ہے۔ صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا:

يَسِّرُوْا وَلاَ تُعَسِّرُوْا وَ بَشِّرُوْا وَلاَ تُنَفِّرُوْا۔

''اس طرح دعوت دو کہ بہ آسانی لوگوں کی سمجھ میں آ جائے، اس طرح دین کو پیش نہ کرو کہ ان کے لیے مشکل بن جائے، اس طرح دعوت دو کہ لوگ دین سے مانوس ہوں اور اس طرح دعوت نہ دو کہ لوگ دین سے متنفر ہو جائیں۔''

یہ ہدایات بلاشبہ دعوت وتبلیغ ہی سے متعلق ہیں اور ظاہر ہے بہت اہم ہدایات ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کا ذمہ دار بنا کر بھیجا تو اس موقعے پر ان کو نصیحت فرمائی:

اِنَّکَ سَتَاتِیْ قَوْمًا اَهْلَ الْکِتٰبِ فَاِذَا جِئْتَهُمْ فَادْعُهُمْ اِلٰی اَنْ یَّشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ فَاِنْ هُمْ

اَطَاعُوْا لَکَ بِذَالِکَ فَاَخْبِرْھُمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْھِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ وَ لَیْلَۃٍ فَاِنْ ھُمْ اَطَاعُوْا لَکَ بِذَالِکَ فَاَخْبِرْھُمْ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْھِمْ صَدَقَۃ تُوْخَذُ مِنْ اَغْنِیَآئِھِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَآئِھِمْ۔

''بے شک تم ان لوگوں کے پاس جاؤ گے جو اہل کتاب ہوں گے، تو جب تم ان کے پاس جاؤ تو انھیں دعوت دو کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں تو اگر وہ تمھاری یہ بات مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان پر ہر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں تو اگر وہ اس بات میں بھی تمھاری اطاعت کریں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور ان کے غریبوں میں تقسیم کی جائے گی۔''

یہ چند حدیثیں بہ طور مثال پیش کی گئی ہیں، جن سے معلوم ہوسکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے بہ ہر حال کچھ متعین اصول اور طریقے ہیں۔ جن کی پابندی مطلوب ہے اور آپؐ نے لوگوں کو اس کا حکم بھی فرمایا ہے اور جہاں تک خود آپؐ کے عمل کا تعلق ہے، اس کا اندازہ بخاری کی اس روایت سے ہوسکتا ہے۔ حضرت ابو وائلؓ فرماتے ہیں:

كان عبد الله يذكِرُ الناس كل خميس فقال له رجل يا ابا عبد الرحمن لوددت انک ذکّرتنا کل یوم فقال اما انه يمنعنى من ذالک انی اکره ان املکم و انی اتخولکم بالموعظة كما كان النبى ﷺ يتخولنا بها مخافة السآمة علينا۔ (بخاری، کتاب العلم)

''عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کے روز لوگوں کی تذکیر کرتے تھے۔ تو ایک شخص نے ان سے کہا اے ابوعبدالرحمن! میری تمنا ہے کہ آپ ہر روز ہمیں (دین کے سلسلے میں) یاددہانی کرائیں۔ تو انھوں نے کہا میں ایسا صرف اس لیے نہیں کرتا کہ مجھے یہ ناپسند ہے کہ تم میری باتوں سے اکتا جاؤ۔ میں تمھیں ناغہ کے ساتھ نصیحت کرتا ہوں، جس طرح نبی ﷺ ناغوں کے ساتھ ہمیں نصیحت فرماتے تھے۔ اس خوف سے کہیں ہم اکتا نہ جائیں۔''

اسی طرح مشہور بات ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بات سے ناگواری ہوتی تو اکثر حالات میں آپؐ بہ راہ راست شخص متعلق سے تعرض کرنے کے بہ جائے فہمائش کا یہ عمومی انداز اختیار فرماتے:

ما بال اقوام یفعلون کذا و کذا۔

''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کرتے ہیں۔''

اور یہ بھی ایک معلوم ہی بات ہے کہ آپؐ کی یہ زبردست خواہش تھی کہ خانۂ کعبہ کا وہ حصہ جو حطیم کہلاتا تھا اور جسے زمانۂ جاہلیت میں خانۂ کعبہ کی تعمیر جدید کے موقعے پر سامان وغیرہ کی قلّت کی بنا پر علیٰحدہ کر دیا گیا تھا۔ اس کو از سر نو خانۂ کعبہ میں شامل فرما دیں لیکن آپؐ نے اس سے اس لیے اجتناب فرمایا کہ لوگ کہیں یہ کہنا نہ شروع کر دیں کہ آپؐ خانۂ کعبہ میں ترمیم یا تبدیلی فرما رہے ہیں۔

تفصیلات بالا کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر قرآن و حدیث میں دعوت و تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ اس کو ہر شخص اپنے من مانے طریقوں سے انجام دینے کے لیے آزاد ہے بلکہ اس کے بھی کچھ متعین طرق و اصول ہیں جن کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور عملاً ان کو برتا بھی گیا ہے۔ پس اگر کوئی شخص دعوت و تبلیغ کے حکم کو بجالانا چاہے لیکن اس کے ان عملی طریقوں کی پابندی نہ کرے، جو قرآن و سنت یا حقیقی داعیانِ حق کے اسوۂ حسنہ سے متعین ہوتے ہیں تو صرف یہی نہیں کہ اس قسم کی غیر محتاط دعوت گوناگوں مفاسد دینی و دنیاوی کا موجب ثابت ہوگی بلکہ ایسا شخص درحقیقت اس بات کا ملزم بھی ٹھہرے گا کہ اس نے دعوت و تبلیغ کے باب میں بہت سی قولی و عملی ہدایات کی پابندی نہیں کی ہے اور اس لحاظ سے ہوسکتا ہے کہ اس کا دعوت و تبلیغ کا کل کام ہی غلط ہو جائے اور غلطیوں کی بنا پر وہ اجر و ثواب کے بہ جائے کسی مواخذہ کا مستحق ہو جائے۔ پس اس معاملے میں صرف خلوص نیت پر تکیہ کر لینا صحیح نہیں ہے، بلکہ دعوت و تبلیغ کے صحیح اصولوں اور طریقوں کا بہ قدرِ ضرورت علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ بے شک جذبہ مخلصانہ کے ساتھ عملاً آدمی اگر کچھ کرنے لگے تو خود تجربہ بہت سے عملی اصولوں کی طرف رہ نمائی کرتا ہے اور یقیناً نئی راہیں اختیار بھی کی جاسکتی ہیں، بہ شرطے کہ وہ متعین اصولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں۔ لیکن اس کے بارے میں اطمینان اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب وہ کم از کم بنیادی اصولی باتوں سے واقف ہو۔

اصل یہ ہے کہ اس معاملے میں بہت افراط و تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ کچھ تو اس طرح کے لوگ ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اور جو محض خلوص نیت ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور دعوت و تبلیغ میں

کسی اصول وضابطہ کی پابندی کو جو بہر حال حالات وظروف کی یک گونہ رعایت پر مبنی ہوں گے، منافی خلوص سمجھتے ہیں۔ اور کچھ ایسے لوگ ہیں جن پر حالات وظروف کی رعایت کا اس درجہ غلبہ ہوتا ہے کہ اس میں مصلحت کے سوا اور کسی اصول کے پابند رہنا نہیں چاہتے اور اپنے کو تمام تر بس حالات و ظروف ہی کے تابع کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ نہ یہ صحیح ہے کہ آدمی اپنا فریضہ بس اتنا ہی سمجھے کہ اسے حق بات جس طرح بھی ہو پہنچا دینی ہے اور حالات و ظروف کی کسی درجہ میں رعایت کو بھی نا محمود اور غیر پسندیدہ خیال کیا جانے لگے اور نہ یہ کہ صرف حالات وظروف ہی پر نگاہ رکھی جائے اور شہادت حق کے جو تقاضے ہو سکتے ہیں اور قرآن وسنت میں اس بارے میں، جو ہدایات وارد ہوئی ہیں ان کو بالکلیہ نظر انداز کر دیا جائے، بلکہ صحیح راہ یہ ہے کہ ان دونوں میں صحیح اعتدال وتوازن پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یعنی شہادت حق کے تقاضوں اور حالات وظروف کے مطالبوں میں صحیح تطبیق پیدا کی جائے اور اس بارے میں قرآن وسنت کی ہدایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو اپنا حقیقی اسوہ بنایا جائے۔ اس طرح جو راہِ عمل متعین ہوگی وہی صحیح راہ عمل ہوگی اور اس پر ہی عمل پیرا ہونے سے اس کام کے صحیح نتائج وثمرات مرتب ہو سکتے ہیں، ورنہ یا تو غیر محتاط تبلیغ، بے جا جوش وخروش کا مظاہرہ بن کر رہ جائے گی اور ظاہر ہے جو جوش وخروش حکمت و بصیرت کے تابع نہ ہو اس کا انجام دین ودنیا دونوں پہلوؤں سے خوش آیند کبھی نہیں ہو سکتا۔ یا حالات و ظروف کی بے قید رعایت تبلیغ حق کی بہ جائے تبلیغ باطل کا ذریعہ بن جائے گی۔ کیوں کہ یہ ناممکن ہے کہ دعوت کو اس طرح حالات وظروف کے تابع کر دینے کے بعد وہ دعوت اپنی حقیقی شکل میں باقی رہ سکے۔ ایک معقول حد سے آگے حالات کا جتنا زیادہ اثر قبول کیا جائے گا اسی نسبت سے اس میں باطل کو گھس پڑنے کا موقع مل جائے گا پس داعیان حق کو ان دونوں ہی سے باحتیاط اپنا دامن بچا کر چلنے کی ضرورت ہے۔ اور یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ اگر تاریخ کے پچھلے ادوار میں اس افراط وتفریط میں بہت سے لوگ مبتلا ہوئے تھے اور اس سے گوناگوں نقصانات دین کو اور امت کو اٹھانے پڑے ہیں تو اس زمانے میں بھی ان میں مبتلا ہونے کے اسباب کم وبیش بدستور موجود ہیں بلکہ جہاں تک تفریط کا تعلق ہے اس میں مبتلا ہونے کے اسباب تو نسبتاً زیادہ قوت وشدت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس زمانہ میں پہلے سے کہیں زیادہ باطل کا دوردورہ ہے اور باطل کے دوردورہ کے اثرات دونوں ہی طرح کے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی کہ زیادہ حساس لوگ جو علم وبصیرت کم اور جوش وخروش زیادہ رکھتے ہوں۔ اپنے جوش وخروش سے مجبور ہو کر ہر قسم کی حکمت ومصلحت سے آنکھیں بند کر کے شہادتِ حق

کے میدان میں کود پڑیں۔ اور یہ بھی کہ بہت سے لوگ اس کے زیر اثر اپنی زمام کار مصلحت اندیشی کے ہاتھ میں دے دیں اور شہادت حق کے صریح تقاضوں کو بھی نظر انداز کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ لیکن چوں کہ باطل ایک مدت سے ہر چہار سو چھایا ہوا ہے اور اس نے احساس حق کو بہ اہتمام شدت سے کچل دینے کی کوشش کی ہے، اس لیے رواج عام بہ ہر حال مصلحت اندیشی کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

تاہم اس موقعے پر ہم تفریط کی بہ جائے افراط ہی کے پہلو سے بچنے کی طرف زیادہ توجہ مبذول کرانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کیوں کہ تفریط کے فتنے میں حقیقی علم برداران حق کے مبتلا ہونے کا اندیشہ کم ہی ہوتا ہے۔ اس کے شکار زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو دین سے زیادہ دنیا عزیز ہو۔ وہ بہ ظاہر داعیِ حق ہی کے روپ میں اپنے کو کیوں نہ پیش کرتے ہوں اور اس کے برعکس افراط کے فتنے میں وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جن میں جوش حق ضرورت سے بھی کچھ زیادہ ہوتا ہے اور خلوص کی بھی ان میں کمی نہیں ہوتی۔ بس کمی صرف علم و واقفیت اور حکمت و بصیرت کی ہوتی ہے، جو ان کے جوش و خروش کو قابو میں رکھ سکے اور یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ دولت اس زمانے میں کتنی کمیاب ہے۔

بہ ہر حال ایک داعی حق کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ وہ خود حق سے آگاہ ہو اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حق کو پیش کرنے کے صحیح طریقوں سے بھی واقف ہو۔ اس غرض کے لیے اسے کتاب و سنت کے احکام و ہدایات سے پوری طرح واقفیت بہم پہنچانے کے ساتھ حقیقی داعیان حق یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کے عملی نمونوں کو بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے، اس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ افراط و تفریط دونوں سے محفوظ رہتے ہوئے اپنی بہتر صلاحیتوں کو زیادہ بہتر طور سے ان کے صحیح مواقع پر استعمال کر سکے گا۔ اور اس کی دعوت و تبلیغ دین و دنیا دونوں میں خیر و برکت کا موجب ثابت ہوگی۔ اور اس سے بھی بڑی چیز یہ ہے کہ اسے صرف اپنے علم و واقفیت اور دانش و حکمت ہی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے، بل کہ ہمہ آن خدا کی طرف متوجہ ہو کر اسی سے یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ وہ لغزشوں اور غلطیوں سے محفوظ رکھے اور اپنی راہ پر چلنے اور اس کی بہتر سے بہتر خدمت انجام دینے کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

مولانا جلیل احسن ندویؒ

داعیانِ حق کے اوصاف

(یہ وہ مقالہ ہے جو جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع حیدرآباد کے موقعے پر پڑھ کر سنایا گیا)

راہِ حق کے ساتھیو! اشباح وقوالب اور خارجی اشکال ومظاہر کے اعتبار سے اگر چہ بہت سے دین اور نظام ہائے حیات زمین پر قائم ہوتے رہے ہیں اور آج بھی وہ بہت سی شکلوں میں نظر آتے ہیں۔ لیکن روح اور نتائج کے اعتبار سے حقیقتاً صرف دو ہی قسم کے نظام قائم ہوئے ہیں اور آج بھی وہی دونوں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک نظام زندگی تو وہ ہے، جو کائنات کے خالق کو انسان کی اجتماعی زندگی کا رب نہیں مانتا۔ وہ چاہے زبان سے کچھ ہی کہتا ہو لیکن اس کے عمل کا فتویٰ یہی ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہدایت نامہ پر اپنی تعمیر نہیں کرتا بلکہ وہ انسانوں کو اس بات کا حق دیتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کے مطابق، اپنے علم وتجربے کی روشنی میں اپنے لیے جیسا چاہیں دستور وقانون بنائیں۔ یہ اس نظام کی اولین اساس ہے، جس پر یہ قائم ہوتا ہے۔ اور اس کی دوسری اساس جو دراصل پہلی اساس کا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ ہے کہ جو کچھ سوچا جائے اور جو کچھ کیا جائے، اسی دنیا کو اور اس کے مادی مفادات کو سامنے رکھ کر سوچا جائے اور کیا جائے۔ اور کسی بھی مرحلے پر موت کے بعد کی زندگی اور اس کے محاسبے کا اور وہاں کی ابدی کام یابی اور دائمی ناکامی کا سوال قطعاً زیر بحث نہ آئے۔ یہ دو بنیادیں ہیں جن پر یہ نظام قائم ہوتا ہے۔ ہمیشہ سے اس کی یہی بنیادیں رہی ہیں اور ہمارے زمانے کا مقبول عام نظام جسے سیکولرزم کہتے ہیں، یہ بھی انھیں دو بنیادوں پر قائم ہوا ہے، جس کی تشریح اور تعبیر اس طرح کی گئی ہے۔

"دنیوی زندگی کے تعلقات ومعاملات کو پیش نظر رکھنا اور آنے والی زندگی کو نظر انداز کر دینا۔"

یعنی سیکولرزم کے بنیادی عناصر دو ہیں: پہلا یہ کہ آخرت کو قطعاً نظر انداز کر دیا جائے اور دوسرا یہ کہ صرف دنیوی زندگی کے تعلقات و معاملات پیش نظر رکھے جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں ہوسکتی ہے کہ یہ عقیدۂ الوہیت اور عقیدۂ آخرت کے انکار پر قائم ہوتا ہے۔ پھر جو لوگ اس نظام کو مانتے ہیں ان کی تعریف اس طرح کی گئی ہے: ''جو مذہبی اعتقادات و عبادات کو مسترد کرتے ہوئے اپنے کو بالکلیہ اس دنیا کے مسائل میں لگا دے۔'' اور بعض دوسرے شارحین نے اس نظام کے مومنین کی تعریف اس طرح کی ہے کہ، جو تمام مذہبی نظام اور طریقۂ عبادت کو رد کر کے موجودہ زندگی کے مسائل اور تقاضوں کا ہوتا رہتا ہے۔'' اور تیسری تعریف ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے: ''جو انسان کے روحانی تقاضوں سے صرفِ نظر کر کے اپنی اور اوروں کی مادی خوش حالی میں اعتقاد رکھتا ہے۔'' اور اس نظام کے ماننے والوں کی یہ علامت بھی بتائی گئی ہے:

> ''جو یقین رکھتا ہو اس بات میں کہ مذہب کو پبلک تعلیم اور امور عامہ کے انصرام اور انتظام میں قطعاً دخل نہ دینا چاہیے۔''

یہ ہے وہ پہلا نظام جو مذکورہ بالا دونوں بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے یہ اپنی روح اور نتائج کے اعتبار سے بہت قدیم نظام ہے اگر چہ مختلف اَدوار میں مختلف قالبوں اور نئے نئے ناموں کے ساتھ ظہور پذیر ہوتا رہا ہے۔

اس کے بالمقابل دوسرا نظام وہ ہے، جو خالق کائنات کی ربوبیت اور عقیدۂ آخرت کی اساس پر قائم ہوتا ہے۔ یہ نظام زندگی قطعی طور پر اس بات پر اعتقاد رکھتا ہے کہ کائنات کے خالق ہی کا یہ حق ہے کہ وہ انسانی زندگی کے لیے دستور بنائے اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی غلطی اور نادانی یہ ہے کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق جیسا چاہے اپنے لیے ہدایت نامہ وضع کرے۔ یہ نادانی ہے اور اس کا انجام مکمل تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ پھر یہ نظام مادی زندگی اور اس کے مسائل کو مقصود نہیں بناتا بلکہ آخرت کو مقصود بنا کر اس کی روشنی میں مادی مسائل کو حل کرتا ہے۔

یہ ہے دونوں قسم کے نظام ہائے زندگی کا نہایت مختصر تعارف۔ اور افسوس ہے ان پر جو الحادی نظام پر اعتقاد رکھتے اور عملاً اسے اختیار کرتے ہیں اور مبارک ہیں وہ لوگ جو آسمانی بادشاہت میں داخل ہوئے۔

میرے ساتھیو! خدا کی حمد بیان کرو کہ مادی الحاد کی اس عالم گیر اندھیاری میں اس نے تمھارے ہاتھ میں یہ چراغ دیا۔

ہم میں کا ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی نظام ہو، اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو ایک خاص طرز کی تربیت دیتا اور ایک مخصوص قالب میں ڈھالتا ہے۔ ہم آپ جس دین اور نظام پر ایمان لائے ہیں اور جسے لے کر اٹھنے کی توفیق پائی ہے، اس کا بھی اپنا ایک مخصوص مزاج ہے، وہ اپنے ماننے والوں کو ایک مخصوص قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے اور ان سے ایک مخصوص طرز کی سیرت کا مطالبہ کرتا ہے۔ پس جب کہ اللہ نے ہم کو دعوت الی الحق اور قیام بالدین کی نعمت سے نوازا ہے تو ہمارا اولین فرض ہے کہ ہمارے دل اس کی حمد وشکر سے سرشار ہوں تاکہ کرم مزید کے مستحق قرار پائیں۔ خدا کی سنت جاریہ یہ ہے کہ جب کوئی ایک نعمت پا کر اس کی حمد کرتا ہے تو اسے دوسری بڑی نعمت کی طرف بڑھنے اور اس پر شکر کرنے کی استعداد عنایت کرتا ہے۔ پس اس پہلی نعمت پر ہم کو اس کے سامنے جھک جانا چاہیے اور آگے کی مزید نعمتوں کے ملنے کا استحقاق پیدا کرنے میں لگ جانا چاہیے اور معلوم کرنا چاہیے کہ اللہ رب العالمین کن لوگوں کے ہاتھوں اپنی اطاعت کا نظام قائم کراتا ہے اور وہ کیسے اور کن صفات کے لوگ ہوتے ہیں اور کب وہ موقع آتا ہے جب وہ اپنی امانت کبریٰ ان کے ہاتھ میں دیتا ہے تاکہ نامطلوب صفات وملکات کو دبانے کی راہ سہل ہو اور مطلوب صفات جلد سے جلد راسخ اور نمو پذیر ہوں۔ اگر ہم اس موقف میں، موقف کے مناسب تطہیر وتزکیہ میں سرگرم نہ ہوں گے تو بہر حال خدا سے ہمارا کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے اس کا جو قانون ہمیشہ سے بندوں پر نافذ ہوتا رہا ہے، ہمارے اوپر بھی نافذ ہوگا۔ اور وہ نہایت خوف ناک قانون ہے، جو قرآن مجید میں صاف صاف مختلف طریقوں سے بیان ہوا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی نعمت پا کر اس پر حمد وشکر ادا کرنے میں لگ جاتا ہے تو خدا اس کے قلب پر اپنی رحمت کی بارش کرتا ہے، جس کی وجہ سے قلب کی زمین مزید نرم ہو جاتی ہے اور شکر کی راہ پر پہلے سے زیادہ تیزی سے دوڑنے لگتا ہے یہاں تک کہ یہ شخص پہلی نعمت سے بڑی نعمت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ایک پیسہ کی امانت مالک کی طرف سے اسی کے سپرد کی جاتی ہے جو ایک کوڑی میں اپنا امین ہونا ثابت کردے۔

قانون کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو شخص نعمت پا کر اس پر حمد وشکر نہیں کرتا تو خدا اس کے قلب کی زمین پر رحمت کی بارش نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ آگے کی بڑی نعمت کی طرف بڑھنے کی استعداد و صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے یہی نہیں بلکہ پہلی نعمت کا جو مقام اسے حاصل تھا اس سے بھی گرادیا جاتا ہے اور وہ نعمت اس سے چھن جاتی ہے جو ایک پیسہ کی امانت میں کھرا ثابت نہ ہو، تو مالک اس کی امانت میں اپنی کوڑی بھی نہیں رہنے دیتا۔ قرآنی تاریخ میں اس قانونی فیصلے کے بہت سے نظائر ہیں۔

اور کیا ابھی ماضی قریب میں اپنے ملک میں آپ نے نہیں دیکھا کہ کچھ لوگوں کو اللہ نے محض اپنے فضل سے داعی کے موقف پر کھڑا کیا اور ان کو دعوت الی اللہ کی نعمت سے نوازا لیکن شاید انھوں نے دماغ و قلب پر قناعت کی اور قلب کی زمین کی آب یاری نہ کی تو کس طرح خدا کا قانون عدل و حکمت نافذ ہوا۔ آج وہ کہاں ہیں؟ انھیں اپنے موقف پر آج آپ پاتے ہیں؟ یقین کیجیے کہ ہمارا یہ چراغ دنیا کو راستہ نہیں دکھا سکتا جب تک اس کا روغن شامی زیتون کے مانند صاف نہ ہو اور ہمارا یہ درخت کبھی وہ شجرۂ طیبہ نہیں بن سکتا، جس کے سایے میں آفتاب کے جھلسے اور تھکے ماندے قافلے آرام لیتے ہیں جب تک کہ ہم آپ مل کر اپنی روح کو دعوت کا آشیانہ نہیں بناتے اور جب تک ہمارے قلوب پر یادِ آخرت کی پیہم بارش نہیں ہوتی۔ اور جب تک وہ غم عشق نہیں ابھرتا جو غم روزگار کو بالکل ہی بھلا دیتا ہے اور یہ غم کس طرح ابھرتا ہے؟ اس کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے تعلق باللہ۔

ہم کو ہمیشہ اسی بات کی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ یہ کام جس کے لیے ہم اٹھے ہیں سراسر تعلق باللہ ہی کے بل پر چل سکتا ہے۔ یہ اتنا ہی مضبوط ہو گا جتنا اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط ہو گا اور یہ اتنا ہی کم زور ہو گا جتنا خدانخواستہ اللہ سے ہمارا تعلق کم زور ہو گا۔ جب ہماری زندگی کا نصب العین اس کو راضی کرنا قرار پایا تو کھلی ہوئی بات ہے کہ جب اللہ ہی سے ہمارا تعلق گہرا اور مضبوط نہ ہو تو ہمارا یہ کام کس طرح چل سکتا ہے؟ اور اس میں سرگرمی کس طرح ہو سکتی ہے؟

رفیقانِ راہ! میں پہلے کہہ چکا ہوں اور یہاں پھر یاد دلانے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ اس عالم گیر اور ہمہ گیر تاریکی کے زمانے میں اللہ ربّ العلمین نے ہم پر رحم فرمایا اور ایک بڑی نعمت بخشی اور وہ دعوت الی اللہ اور اقامت دین کی توفیق ہے۔ یہ حقیقتاً ایک بڑی نعمت اور نہایت باکرامت موقف ہے۔ اس کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ سے اپنا تعلق بڑھائیں۔ اس کے بڑھنے کے دو ہی طریقے ہیں: ایک فکری طریقہ اور دوسرا عملی طریقہ۔ فکری طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کے ذریعے ان نسبتوں کو تفصیل کے ساتھ جانیں، جو ہمارے اور خدا کے درمیان فطرتاً ہیں اور بالفعل ہونی چاہئیں۔ پھر ان نسبتوں کا استحضار ہو اور برابر جائزہ لیتے رہیں کہ ان نسبتوں کے لحاظ سے ہم کس مقام پر ہیں۔ اور استحضار و محاسبے کو نشو و نما دینے کی صحیح تدبیر یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو اور پھر حدیث کو سمجھ کر بار بار پڑھتے رہیں۔ لیکن مجرد یہ نظری طریقہ ہم کو کہیں نہیں پہنچا سکتا اور نہ دیرپا ثابت ہوتا ہے جب تک عملی طریقہ نہ برتا جائے۔ اور عملی طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ علم صحیح کے مطابق احکام الٰہی کی مخلصانہ بجا آوری میں لگ جائیں۔ اور یہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، ایک نہایت دشوار

گزار گھاٹی ہے، جس پر چڑھنے کے لیے بڑی طاقت درکار ہے اور قرآن کریم ہم کو بتاتا ہے کہ اس طاقت کا منبع نماز ہے۔ نماز کا دین میں کیا مقام ہے اور داعیان حق کے لیے وہ کیا کچھ ہے؟ اس کو جاننے کے لیے جناب مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا رسالہ ''حقیقت نماز'' اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر سورۂ کوثر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں یہاں صرف اتنی بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ داعی گروہ کی نماز کیسی ہوتی ہے؟ اور اقامت دین کا کام کرنے والے گزشتہ ادوار تاریخ میں اس کا کس درجہ اہتمام کرتے رہے ہیں؟ اس لحاظ سے جب ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو سخت بے چینی محسوس کرتے ہیں۔

کیا ہم نے اجتماعی طور پر دعوت کے اس پہلے مرحلے میں اپنی نمازوں کو ٹھیک کرلیا ہے۔ یہ بات تو قابل اطمینان ہے کہ دعوت سے وابستگی رکھنے والوں میں بحمد اللہ کوئی تارکِ صلوٰۃ نہیں ہے۔ لیکن یہ بات تشویش ناک ہے کہ ہم میں اب بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو نماز باجماعت کے ٹھیک ٹھیک پابند نہیں ہیں حالاں کہ نماز بلا جماعت داعیان حق کی نماز پر نہیں ہے۔ پھر ہم اجتماعی طور پر نماز کا ٹھیک ٹھیک داعیانہ اہتمام بھی نہیں کرسکے ہیں، جس کے نتیجے میں ٹھیک وقت پر نہیں پہنچتے اور آج بھی ہمارے بہت سے سجدے نقرُ الدِّیکُ (جیسے مرغ چونچ مارتا ہے) کی مثال پیش کرتے ہیں اور ہمارے بہت سے تاجروں، صنّاعوں اور کسانوں کو جو نہایت مشغولیت کا کام کرتے ہیں نماز باجماعت اور اس کے اندر پوری طرح مشغول نہیں کرسکی ہے۔ اسی طرح ہمارے بعض معلمین، متعلمین اور مطالعہ کرنے والے اذان سنتے ہی اپنا کام چھوڑ کر دوڑ نہیں پڑتے۔ پھر ہمارے یہ سجدے، رکوع اور قیام و قعود کی حالتیں دل کی پگھلاہٹ (خشوع) کا پتہ کم دیتی ہیں۔

ہم کو یہ بات گرہ کرلینی چاہیے اور کسی وقت فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہم داعی گروہ کے موقف میں ہیں، جس کے لیے نماز کے سوا اور کوئی غذا نہیں۔ اور یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اقامت دین ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم نماز نہ قائم کرلیں۔ یہ زمین نہیں سنواری جاسکتی جب تک کہ ہم اپنی نمازوں کو نہ سنوار لیں۔

قرآن کریم کی دوسری سورہ، سورۂ بقرہ میں یہ اسلوب کہ ابتدا میں اقامت صلوٰۃ کا حکم اور آخر میں محافظت صلوٰۃ کی تاکید اور بیچ میں احکام وشرائع کی بنیاد کا بیان۔ یہ اسلوب صاف صاف بتاتا ہے کہ نماز تمام شرائع واحکام کی بنیاد اور نماز کے قیام پر ان کا قیام وبقا منحصر ہے۔ نیز یہ اسلوب اس بات کی طرف صاف اشارہ کرتا ہے کہ ہمارے ہاتھوں کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم نماز میں کچھ نہ ہوئے اور ہمارے کم زور ہاتھوں سے سنوار کا بہت کچھ کام ہوگا اگر ہماری نمازیں مطلوب حد تک سنور جائیں

یہی بات ہے جسے حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے ایک بلیغ اسلوب میں اس طرح فرمایا ہے:

انّ اهم امورکم عندی الصلوٰة من حفظها و حافظ عليها حفظ دينه و من ضيّعها فهو لما سواها اضيع

"تمھارے معاملات میں میرے نزدیک اہم واقدم نماز ہے۔ جو اس کی حفاظت و نگہ داشت کرے گا وہ اپنے پورے دین کی نگہ داشت کرے گا اور جو اس کو ضائع کر دے گا وہ بقیہ امور کو بہ درجہ اولیٰ ضائع کرے گا۔"

اس ارشاد سے جو واضح ہدایت ہم کو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ جس نسبت سے ہماری نمازیں ڈھیلی اور کم زور رہیں گی، اسی نسبت سے ہمارے پورے جماعتی نظام میں اور تمام امور میں ڈھیلا پن محسوس ہوگا۔

پس اولیں ممتاز صفت جو کسی داعی گروہ کی ہوتی ہے اور ہمیشہ سے رہی ہے اور آج بھی ہونی چاہیے وہ یہی اقامت صلوٰة کی صفت ہے اور اس میں وہ آخری نقطہ اور غایت جہاں ہمیں پہنچنا ہے اس کی نشان دہی نبی اکرم ﷺ نے فرما دی ہے۔ جب نماز کا وقت آتا تو آپ حضرت بلالؓ سے یوں فرماتے:

اَقِمِ الصَّلوٰةَ یا بلال اَرِحْنابها۔

"اے بلال نماز قائم کرنے کا بندوبست کرو تا کہ ہم راحت و سرور کے منبع و مصدر یعنی نماز میں داخل ہوں۔"

اسی طرح آپؐ نے ارشاد فرمایا:

جُعِلَتْ قُرةُ عینی فی الصلوٰة۔

"نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔"

ان دونوں ارشادات سے معلوم ہوا کہ ہمیں جہاں بہ ہر حال پہنچنا ہے وہ یہ ہے کہ نماز ہماری بھوک پیاس بن جائے، نماز ہماری غذا بن جائے، نماز ہمارے لیے راحت و سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائے۔

یہ ہے وہ پہلی صفت، بلکہ تمام اوصاف و حسنات کا سرچشمہ۔ اگر یہ صفت نہ ہو تو پھر کوئی داعیانہ صفت کسی دوسرے طریقے سے نہ کبھی پیدا ہوئی ہے اور نہ آئندہ کبھی پیدا ہونے کا امکان ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

نماز کے بعد دوسری ممتاز صفت جو کسی داعی گروہ میں ہونی چاہیے وہ "انفاق فی سبیل اللہ" کی

صفت ہے۔ یہ ایک نہایت جامع لفظ ہے، جو انفاقِ مفروض یعنی زکوٰۃ، عام صدقات اور ہر طرح کے ایثار پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ انفاق تزکیۂ نفس کے ان اہم ترین ذرائع میں سے ہے جو خدا اور رسول نے بتائے ہیں۔ دوسری بات یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اصل چیز مال کی وہ مقدار نہیں ہے جو آدمی خدا کی راہ میں دیتا ہے بلکہ وہ قربانی ہے جو اللہ کی خاطر آدمی کرتا ہے، جس طرح وہ دو روزہ دار اجر میں برابر نہیں ہو سکتے جن میں سے ایک ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ کر آرام سے دن گزارتا ہے اور دوسرا جھلس دینے والی لو میں سارے دن اپنے کھیت کو پانی دیتا ہے۔ اسی طرح وہ دو خرچ کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے جن میں سے ایک دولت مند ہے، اپنی آسائشوں کا دسواں یا بیسواں حصہ قربان کر کے ایک ہزار روپے دیتا ہے اور دوسرا ایک غریب آدمی ہے جو اپنا پیٹ کاٹ کر خدا کی راہ میں صرف ایک پیسہ دیتا ہے۔۔۔ یقیناً یہ ایک پیسہ اللہ کے ہاں دولت مند کے ایک ہزار روپے سے زیادہ قیمتی ہے۔ تیسری بات یہ سمجھ لیجیے کہ انفاق کے بعض مواقع بعض سے اہم اور اقدم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اہم مواقع پر خرچ نہیں کرتا اور ان مواقع پر خرچ کرتا ہے جن کی اس ہنگامی حالت میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تو ایسے انفاق کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے بلکہ اسے انفاق کہنا ہی صحیح نہیں ہے۔ اور اس سے آدمی کے اندر وہ بھلائی نہیں پیدا ہوتی جو انفاق سے پیدا ہوا کرتی ہے۔

چوتھی چیز جس سے بالعموم ہم غافل ہیں۔ وہ یہ حقیقت ہے کہ جس طرح پودے کی جڑ کو خشک ہوتے ہوئے دیکھنا اور بڑی بڑی شاخوں اور پتوں کو پانی دینا، پودے کے لیے کچھ بھی مفید نہیں کیوں کہ پتوں اور شاخوں کی زندگی تو جڑ اور تنہ کی زندگی سے وابستہ ہے۔ اگر جڑ خشک ہو گئی تو پتوں اور شاخوں پر پانی کا سیلاب بہا دینے سے بھی انھیں زندگی نہیں مل سکتی اور پتوں کو سیراب کرنا ایسی صورت میں کوئی قابلِ قدر کام نہیں تصور کیا جاسکتا۔ بالکل یہی مقام دعوت کی تاریخ میں مرکزی ادارہ اور جماعت کا ہے۔ اگر کسی موقعے پر صورتِ حال یہ ہو جائے کہ دعوت کے اہم ترین شعبے مرجھا رہے ہوں اور ہم جزئی شعبوں میں انفاق کو ترجیح دے رہے ہوں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اور یقین قرآن و حدیث کے تھوڑے سے مطالعے سے پیدا ہوا ہے کہ یہ ایک خطرناک حالت ہے جس میں کوئی داعی حق گروہ مبتلا ہو سکتا ہے۔ چاہے یہ جماعت اس عہد کی جماعت ہو، چاہے ہم آپ ہوں، چاہے وہ لوگ ہوں جو ہمارے بعد آئیں گے اور کسی بھی ملک میں جماعت بن کر کام کریں گے۔ یہ صورتِ حال ہمیشہ سے خطرناک رہی ہے، اس لیے اس معاملے میں بہت زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے کہ ہم کن مواقع پر خرچ کر رہے ہیں اور ان میں سے اہمیت کسے حاصل ہے؟ جس طرح اور

معاملات میں اصل کو فروع بنا دینا یا فروع کو اصل کی اہمیت دینا ناجائز ہے اسی طرح اس معاملے میں بھی افراط و تفریط غیر دینی ہے۔

پس نماز کے بعد دوسری چیز جس کی فکر ہونی چاہیے، وہ یہی انفاق ہے اور ان لوگوں کو زیادہ فکر ہونی چاہیے جو کچھ زیادہ خوش حال نہیں ہیں اور ہم میں کم ہی خوش حال ہیں۔ کیوں کہ جس اجر عظیم کی بشارت تنگی کی حالت میں انفاق پر دی گئی ہے وہ ہمارے اس حقیر مال سے کہیں زیادہ ہے جو ہم خدا کے کام پر خرچ کریں گے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضَاعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ o یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

(الحدید: ۱۱، ۱۲)

”ہے کوئی جو اللہ کو قرض حسن دے تو اس کو اضعاف و مضاعف کر دے اور اس کے لیے باعزت اجر ہے۔ اس دن جب تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے داہنے چلتا ہے۔ بشارت ہے تمھارے لیے آج جنتیں جو سدا بہار ہیں۔“

اور اس باب میں جس غایت تک پہنچنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے اولوالامر ہمیں اس بات کی تلقین کرنے لگیں، جس کی تلقین ان آیات میں کی گئی ہے:

وَالَّذِیْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا o

(الفرقان: ۶۷)

”وہ لوگ جو ــ جب انفاق کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل کرتے ہیں اور ان کا رویہ اعتدال کا ہوتا ہے۔“

(۲) وَلَا تَجْعَلْ یَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا o

(بنی اسرائیل: ۲۹)

”اپنے ہاتھ کو نہ تو (بخل سے) گلے کا طوق بنالو اور نہ اسے بالکل کھول دو کہ نتیجتاً تم بخل کی وجہ سے لوگوں کی ملامت کے مستحق ہو جاؤ یا انتہائی فیاضی کی وجہ سے عاجز و درماندہ۔“

اس راہ میں صحابہ کرام اتنی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو انھیں اعتدال اور میانہ روی کی ہدایت دینی پڑی۔ اس کی تفصیل طولانی ہے اور آپ کے لیے اشارہ کافی ہے۔

یہ صفت جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ہمارے اندر اسی نسبت سے ابھرے گی، جس نسبت

سے ہمارے اندر صحیح اقامت صلوٰۃ کی صفت ابھرے گی۔ آدمی کا ہاتھ اس کی اپنی جیب میں کبھی نہیں جا سکتا جب تک کہ حرص و بخل اور مادیت نہیں دبتی اور جب تک فقر و فاقہ کا اندیشہ باقی رہتا ہے اور مادیت کو دبانے کا صرف ایک ہی طریقہ اللہ نے بتایا اور وہ نماز ہے۔ یہ صرف نماز ہی کی خاصیت ہے، جو آدمی کے دل کو شکر کے جذبے سے معمور کرتی اور حرص و بخل کی جڑ اکھاڑتی ہے۔

صبر

تیسری صفت جو داعیان حق میں پائی جانی چاہیے وہ صبر کی صفت ہے، جس کے لغوی معنی استقلال اور جماؤ کے ہیں اور اس کے بے شمار پہلو ہیں۔ سب سے اہم اور اقدم پہلو یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس سے لڑائی کر کے اسے طاعت رب پر جمائے، یہ صبر کا مقام ہے، اور اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ بقیہ تمام مقامات صبر میں جمنے کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ اور ایک پہلو یہ ہے کہ دعوت کی راہ میں پہلا قدم رکھتے ہی اندر اور باہر کے لوگ، اپنے اور بیگانے اور اپنے سب سے پہلے پھبتیوں اور فقرے بازیوں سے اس کی ہمت توڑ دینا چاہتے ہیں۔ ایسے موقع پر ان پھبتیوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لے جانا یہ صبر کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ دعوت کی راہ پر چلنے کے نتیجے میں جو معاشی صدمے اٹھانے پڑیں، انھیں صحیح جذبے کے ساتھ انگیز کیا جائے۔ اور اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ دنیا کے باطل معاشی آسانیوں کے طریقے اس کے سامنے آئیں لیکن ادھر سے آنکھیں پھیر لی جائیں اور کان بہرے کر لیے جائیں۔ اور اس کا سب سے زیادہ جانکاہ اور جاں گسل پہلو یہ ہے کہ داعی کو دور دور تک کہیں بھی اپنی ظاہری کام یابی کی کوئی روشنی نظر نہ آتی ہو لیکن پھر بھی اطمینان و سکون سے وہ اپنا کام کیے جائے۔ بغیر اس کے کہ اس کے اندر جلد بازی کا کوئی جذبہ پیدا ہو اور بغیر اس کے کہ مایوسی کا کوئی شیطانی حملہ ہو۔

دعوت کی تاریخ میں ایسے بہت سے مراحل آتے ہیں، جو سختی اور شدت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لحاظ سے مختلف مراحل میں صبر کے اجر میں بھی تفاوت ہوگا۔ اس کی توضیح کے لیے ایک حدیث کا سننا نافع ہوگا۔ مدنی زندگی کے اواخر میں جب اسلام نے جڑ پکڑ لی اور ایک نظام کی حیثیت سے قائم ہو گیا تو اسی دور میں آپؐ نے ایک دن ارشاد فرمایا: ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھوں۔'' صحابہ نے عرض کیا ''کیا ہم آپ کے اخوان نہیں ہیں؟'' آپ نے فرمایا ''نہیں، تم میرے ساتھی اور رفیق ہو، میرے بھائی تو وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے اور مجھ پر ایمان لائیں گے، میری امامت کے تحت اپنی زندگی گزاریں گے، حالاں کہ

انھوں نے مجھ کونہیں دیکھا اور میرا زمانہ نہیں پایا۔ وہ جن سخت حالات سے دو چار ہوں گے ان حالات میں ان میں سے ہر ایک کو پچاس آدمیوں کے برابر اجر ملے گا۔'' صحابہ نے عرض کیا کہ ان میں سے پچاس آدمیوں کے برابر؟ آپ نے فرمایا'' نہیں، تم میں سے پچاس آدمیوں کے برابر اور یہ اس لیے کہ تمھاری راہ سے کانٹے ہٹ گئے ہیں، تمھاری راہ آسان اور فراخ ہو چکی ہے اور اس پر چلنا آسان ہو گیا ہے، پھر تمھارے اعوان و انصار بہت ہیں۔ اور ان کی راہیں رندھی ہوئی ہوں گی اور راہ حق کے ساتھی اور مددگار نہ پارہے ہوں گے۔''

یہ کتاب الفتن کی ایک حدیث ہے جو بہ اختلاف الفاظ چند طریقوں سے بیان ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جتنا نامساعد اور حالات جتنے ہی ناموافق ہوں گے، دین کا کام کرنے پر مالک کی طرف سے اتنی زیادہ مزدوری ملے گی اور جو جتنا کھوئے گا، اس سے زیادہ پائے گا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۵۸، ۵۹)

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے ان کو ہم جنت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور بہترین ہے یہ عمل کرنے والوں کا اجر، جو صبر کرتے ہیں اور اپنے رب ہی پر بھروسا کرتے ہیں۔''

سمع و طاعت

چوتھی صفت جو داعی گروہ میں ہونی چاہیے وہ سمع و طاعت اور نظم جماعت کی پابندی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے دعوتی سرمایہ میں بہت کچھ اور نہایت عمدہ اسلوب سے بتایا جا چکا ہے لیکن اس کے باوجود ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں اور آپ بھی یقیناً محسوس کرتے ہوں گے کہ اس کی طرف بار بار توجہ دلائی جائے۔ اس لیے یہاں پر ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

''اسلامی نقطۂ نظر سے اقامت دین کی سعی کرنے والی ایک جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف دراصل اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا ایک جز ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو اپنا امیر مانا ہے، وہ اس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل اس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا

ہے۔جس قدر اللہ سے اور اس کے دین سے آدمی کا تعلق زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ سمع و طاعت میں بڑھا ہوا ہوگا اور جتنی اس تعلق میں کمی ہوگی اتنی ہی سمع و طاعت میں بھی کمی ہوگی۔اس سے بڑی قابل قدر قربانی اور کیا ہوسکتی ہے کہ جس شخص کا آپ پر کوئی زور نہیں ہے اور جسے محض خدا کے کام کے لیے آپ نے امیر مانا ہے، اس کا حکم آپ ایک وفادار ماتحت کی طرح مانیں۔اور اپنی خواہش اور پسند اور مفاد کے خلاف اس کے ناگوار احکام تک کی بسر و چشم تعمیل کرتے چلے جائیں۔یہ قربانی چوں کہ اللہ کے لیے ہے، اس لیے اس کا اجر بھی اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے۔اس کے برعکس جو شخص اس کام میں شریک ہونے کے بعد بھی کسی حال میں چھوٹا بننے پر راضی نہ ہو اور اطاعت کو اپنے مرتبے سے گری ہوئی چیز سمجھے یا حکم کی چوٹ اپنے نفس کی گہرائیوں میں محسوس کرے اور تلخی کے ساتھ اس پر تلملائے یا اپنی خواہش اور مفاد کے خلاف احکام کو ماننے میں ہچکچائے وہ دراصل اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ابھی اس کے نفس نے اللہ کے آگے پوری طرح سر اطاعت خم نہیں کیا ہے۔اور ابھی اس کی انانیت اپنے دعووں سے دست بردار نہیں ہوئی ہے۔“

(کارکنان تحریک اسلامی کے لیے اہم ہدایتیں، ص:۲۸)

یہ ایک اہم اقتباس ہے جو اوپر نقل ہوا ہے اور آخری جملے اس لائق ہیں کہ ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔کیوں کہ اس سلسلے میں ہم لوگوں سے بالعموم کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔رہی وہ ذمہ داری جو اس سلسلے میں اولی الامر پر عائد ہوتی ہے تو اگرچہ وہ بڑی اہم ہے لیکن اس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔

اصلاح ذات البین

یہ وصف بھی اقامت دین کا کام کرنے والی جماعت کے لیے نہایت ضروری ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جماعت کے افراد کو ایک دوسرے کا مددگار، ہم درد اور غم خوار ہونا چاہیے۔ان میں سے ہر ایک کا یہ فرض ہے کہ دوسرے کو سہارا دے کر خدا کی راہ میں آگے بڑھانے کی کوشش کرے۔میں گرتا ہوا نظر آؤں تو آپ دوڑ کر مجھے سنبھالیں اور آپ لغزش کھا رہے ہوں تو میں بڑھ کر آپ کا

ہاتھ تھام لوں۔ میرے دامن پر کوئی دھبّہ نظر آئے تو آپ اسے صاف کریں اور آپ کا دامن آلودہ ہو رہا ہو تو میں اسے پاک کروں۔ میری بہتری جس چیز میں آپ سمجھتے ہوں اسے آپ مجھ تک پہنچائیں، اور میں جس چیز میں آپ کی بھلائی دیکھوں اسے آپ تک پہنچاؤں۔ اسلام میں اجتماعی تزکیہ کا یہی طریقہ ہے۔ لیکن ہم میں یہ خوبی ہر جگہ پوری طرح نہیں ابھری ہے اور ان مقامات پر بسا اوقات ہمارے ساتھیوں میں اچھی خاصی تلخی پیدا ہو جاتی ہے جہاں فروعی مسائل پر اس طرح جم کر مباحثہ ہوتے ہیں جیسے کہ یہ دین کی اساسیات ہیں۔ اس معاملے میں اگر ایسا ہو کہ فقہی مسالک کے ماننے والے اپنی حد تک عمل کرنے میں چاہے جتنی مضبوطی دکھائیں لیکن دوسروں سے مجادلہ مباحثہ نہ کریں، تو یہ وصف تیزی کے ساتھ ہمارے اندر ابھر سکتا ہے، جس کی موجودہ حالت میں نہایت ضرورت ہے اور آگے کے مراحل میں اس کی ضرورت شدید تر ہو جائے گی۔ اس موقعے پر میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس زمانے کی ایک اہم ہدایت نقل کردوں جب کہ جماعت میں پہلا اور شدید فتنہ رونما ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں چند اصحاب جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

”اسی سلسلے کی ایک اور خرابی یہ ہے کہ وہ مختلف عناصر جن سے اس جماعت کی تشکیل ہوئی ہے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے بہ مشکل آمادہ ہوتے ہیں۔ نہ ان میں اتنا صبر ہے کہ ہم دردی کے ساتھ ایک دوسرے کو سمجھیں اور بہ تدریج ایک دوسرے کی اصلاح و تربیت کریں، نہ اتنا انصاف ہے کہ اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی کم زوریوں اور اپنی اور دوسروں کی کم زوریوں کے ساتھ ان کی خوبیوں کا بھی احساس و اعتراف کریں، نہ اتنی لچک ہے کہ کسر و انکسار سے ایک متحد المزاج معجون بننے کے لیے تیار ہوں، نہ اتنا حسنِ ظن ہے کہ جو لوگ انھیں کی طرح ایک دعوت حق پر لبیک کہتے ہوئے آئے ہیں ان کے عمل میں اگر کچھ کوتاہی پائیں تو اس کو ارادی فجور و عصیان یا قصدی غلط کاری کے سوا کسی اور سبب پر بھی محمول کر سکیں۔ ہر ایک جس طبقہ سے آیا ہے اور جس زندگی سے اب تک مانوس رہا ہے اسی میں پوری جماعت کو رنگا ہوا دیکھنا چاہتا ہے اور اس سے مختلف رنگ دیکھ کر دل برداشتہ ہونے لگتا ہے۔ حالاں کہ یہ ذہنیت اس جماعت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے اور اس کا نتیجہ پھر یہی ہو سکتا ہے کہ ایک ایک طبقے اور ایک ایک رنگ کے لوگ الگ

گروہ بن جائیں اور ہر ایک گروہ اپنی خوبیوں کے ساتھ اپنی ان کم زوریوں اور خامیوں کا بھی حامل رہے جن کی بہ دولت اب تک ہمارا کوئی گروہ اقامتِ دین کے لیے کوئی قابل ذکر سعی نہیں کرسکا ہے۔ ہماری اس جماعت کی خوبی یہ تھی کہ اس نے ایک کلمہ اور ایک نصب العین کی کشش سے تمام مختلف طبقات کے لوگوں کو کھینچ کر یک جا کرلیا ہے۔ ان میں وہ نئے طبقہ کے لوگ ہیں جو جاہلیتِ جدیدہ میں غرق ہو چکے تھے اور اب اللہ نے ان کی آنکھیں کھول کر راہ راست انھیں دکھادی۔ ان میں وہ متوسط طبقے کے لوگ بھی ہیں جو نئے اور پرانے رنگ کی مخلوط سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں وہ پرانے رنگ کے لوگ بھی ہیں جن میں کچھ شرعی صورت کی تقالید اور کچھ دور انحطاط کے قدامت پرستانہ تعصبات ملے جلے پائے جاتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک طبقہ اپنے اندر کچھ خوبیاں رکھتا ہے جو دوسرے طبقہ میں نہیں ہیں اور کچھ خرابیاں ہیں جن سے دوسرا طبقہ محفوظ ہے۔ ہماری اس جماعت کی کام یابی کا انحصار اس پر ہے کہ یہ سب مل کر باہمی رفاقت، صحبت اور تعاون سے بہ تدریج ایک دوسرے کی خرابیوں کو دور کرنے اور ایک دوسرے کی خوبیاں جذب کرنے کی کوشش کریں اور یہ تب ہی ہوسکتا ہے کہ ان میں تحمل ہو، صبر ہو، ہم دردی ہو، انصاف ہو، لچک ہو، حسن ظن ہو، لیکن افسوس ہے کہ اب تک یہ اسپرٹ بہت کم پیدا ہوئی ہے۔ خصوصاً پرانے طرز کا طبقہ، اس معاملے میں دوسرے طبقوں کی بہ نسبت زیادہ شدت پسند ثابت ہو رہا ہے۔ یہ لوگ اپنی خوبیوں کا مبالغہ آمیز تصور رکھتے ہیں اور اپنی کم زوریوں کو سمجھنے سے گریز کرتے ہیں، دوسروں کی خوبیوں کا اندازہ ہمیشہ کم لگاتے ہیں اور انھیں جذب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔''

یہ ایک نہایت اہم ہدایت ہے، جس کی روشنی میں ہم تمام دل پھاڑنے والے طرز عمل سے اجتناب کرسکتے ہیں اگر ہمیں واقعتاً یہ کام عزیز ہے۔

صاحبو! یہ ہیں وہ چند بنیادی صفات، جن کی دعوت کے اس مرحلے میں فکر کرنی ضروری ہے۔ اور آخر میں زور دے کر عرض کرتا ہوں کہ آدمی کی تربیت کے لیے روئے زمین پر صرف ایک

ہی کتاب پائی جاتی ہے اور دوسری کوئی کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ وہ کتاب، اللہ کی کتاب قرآن مجید ہے جو بار بار پڑھنے کے لیے، سمجھ کر پڑھنے کے لیے اتاری گئی ہے۔ یہ پڑھنا باہر بھی ہو اور خصوصیت کے ساتھ نماز کے اندر ہو اور صلاح پذیری کی نیت سے ہو۔ اور مشورتاً یہ عرض ہے کہ دعوت کے موجودہ مرحلے میں مسبّحات کی تدریس وتلاوت اور خصوصیت کے ساتھ نماز فجر میں ان کی قرأت ان شاء اللہ ہمارے لیے بہت نافع ہوگی۔ مسبحات سے میری مراد قرآن مجید کا وہ حصہ ہے، جو سورۂ حدید سے شروع ہوتا ہے اور سورۂ تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ہمارے لیے شفاو موعظت اور ہدایت ورحمت ہے۔